امام العصر امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ

اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کو مختلف طبقات، گروہوں، بستیوں، خطوں، برادریوں، اور مملکتوں میں تقسیم کر دیا لیکن ان کی یہ تقسیم کسی افضلیت، مرتبہ، مقام یا کسی علو کی بنیاد نہیں بنائی بلکہ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ کہہ کر واضح کر دیا کہ اصل رشتہ یا اصل بڑائی کا معیار صرف اور صرف تقویٰ ہے اور تقویٰ کا درس ہمیں دین اسلام نے دیا ہے اور یہی رشتہ ہے جس نے مختلف قومیتوں، برادریوں، ذاتوں اور ملکوں کے رہنے والے انسانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا اور سارے کے سارے مسلمان بلا کسی ملک کی تفریق کے اس دین حق کی خدمت میں کمربستہ تھے، ہیں اور رہیں گے۔ ان شاء اللہ۔

برصغیر پاک و ہند ایشیاء کے ان چند خوش قسمت خطوں میں شامل ہے جہاں اسلام کے ایسے ایسے گوہر نایاب پیدا ہوئے جن کی روشنی سے آج بھی اہل اسلام کے قلوب منور ہیں ان ہستیوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ لیکن مثال کے لئے یہاں ان رجال عظیم میں چند ایک کا تذکرہ بطور نمونہ کیا جائے گا اس بات سے کوئی انکار نہیں کہ بخارا کی سرزمین سے امیر المومنین فی الحدیث امام بخاریؒ پیدا ہوئے۔ عراق سے امام مسلم، ترمذی اور نسائی نے جنم لیا۔ غزنی کی سرزمین نے عالم اسلام کو محمود غزنوی جیسا مجاہد عطا کیا لیکن ان سب کے علاوہ برصغیر نے بھی نواب صدیق الحسن خان، سید نذیر حسین محدث دہلوی، شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالغنی، شاہ اسحاق، شاہ رفیع الدین، شاہ اسماعیل، سید احمد، ثناء اللہ امرتسری، حافظ ابراہیم میر سیالکوٹی، حافظ عبداللہ محدث روپڑی، علامہ محمد اقبال، علامہ احسان الٰہی ظہیر، حکیم صادق سیالکوٹی، حافظ محمد شریف رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے علاوہ اور بہت سارے عظیم سپوتوں کو [illegible] کے واسطے میں

یہ خطہ بھی ایشیاء کے دیگر علاقوں سے کم نہیں ہے۔

آج میں قلم و قرطاس کی زبان میں برصغیر پاک و ہند کے ایک ایسے ہی عظیم سپوت کے بارے میں چند منتشر خیالات کو مجتمع کرکے قارئین کی نذر کرنا چاہتا ہوں جس نے بیک وقت کئی محاذوں پر کام کیا اور کم سنی ہی سے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دینا شروع کردیئے جو فی زمانہ شائد ہی کوئی دے سکتا ہو۔ میری مراد امام العصر امام الہند جناب ابوالکلام آزاد ہیں۔ مجھے اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا پورا پورا احساس ہے اور خاص طور پر ایک ایسی ہستی جس کے بارے میں لوگ پی۔ ایچ۔ ڈی تک کرچکے ہوں اور جن کے بارے میں ظفر علی خان، مولانا الطاف حسین حالی، آغا شورش کاشمیری اور علامہ احسان الٰہی ظہیر جیسی عظیم شخصیات اپنے الفاظ میں زبردست خراج تحسین پیش کرچکی ہوں میرے یہ چند الفاظ بظاہر سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہی ہوسکتے ہیں لیکن

خود پیاس کا صحرا ہوں مگر دل کی یہ ضد ہے
ہر دشت پر ساون کی طرح ٹوٹ کے برسوں

کے مصداق اپنی محدود معلومات کو قارئین کی نذر کرنے کی اپنی سی سعی کروں گا۔ اگرچہ اس سلسلہ میں میری معلومات بہت حد تک سطحی ہیں لیکن مناسب خیال کیا کہ "رشد" کے قارئین کو اس سلسلہ میں ضرور آگاہ کیا جائے۔

کائنات کا ایک اصول ہے کہ جن لوگوں نے آنے والے وقتوں میں کوئی نام پیدا کرنا ہوتا ہے ان کے عنوانات ابتدا ہی سے ظاہر ہوتے ہیں خوش قسمتی سے مولانا ابوالکلام آزاد کو صغر سنی سے ہی اردو ادب، تحریر اور خطابت سے گہری دلچسپی تھی "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مصداق یہ فنون انہوں نے اپنے والد گرامی جناب مولانا خیرالدین سے ورثے میں حاصل کئے تھے کیونکہ مولانا خیرالدین بذات خود علماء اور مشائخ کے طبقہ میں ایک منفرد اور ممتاز مقام کے حامل تھے لہٰذا یہی فنون انہوں نے اپنے فرزند ارجمند کو منتقل کیے اور اپنے والد گرامی کی خطابت سے متاثر ہوکر ابوالکلام کو بھی

اس میدان میں کارنامے سرانجام دینے کا شوق پیدا ہوا اور شوق کے ساتھ صلاحیت، ارادوں اور بے مثال حافظے نے آنے والے اوقات میں ابوالکلام کو واقعی اسم بامسمی بنا دیا۔

مالک رام نے ابوالکلام کے جو خطبات مرتب کیے ہیں ان کے مقدمے میں آپ کے بچپن کے حوالے سے ان کی بڑی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ بیگم کا ایک بیان بھی ایک جریدے "آج کل ستمبر1959ء" کے حوالے سے نقل کیا ہے جس میں محترمہ فرماتی ہیں کہ:

> "بچپن میں بھائی کو ان کھیلوں کا کوئی شوق نہیں تھا جو اکثر بچے کھیلا کرتے ہیں ان کے کھیل بچپن میں عجیب ہوا کرتے تھے مثلاً کبھی سر پر والد محترم کی پگڑی باندھ کر اپنے بہن بھائیوں کو اکٹھا کر کے کہتے کہ تم لوگ چلا چلا کر کہو! راستہ دو دہلی کے مولانا آرہے ہیں پھر آہستہ آہستہ ایسے قدموں سے چلتے گویا کہ کوئی بہت بڑی شخصیت چل رہی ہے"

اور مولانا کے بچپن کے کارناموں کا ایک ثبوت مجھے اس وقت بھی ملا جب میں نے آغا شورش کاشمیری صاحب کے رفیق خاص جناب صلاح الدین صاحب سے ملاقات کی اور انہوں نے آغا صاحب سے سنا ہوا مولانا کا ایک مشہور واقعہ سنایا جو کچھ ان الفاظ میں تھا۔

بچپن میں اس وقت جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد کی عمر کم و بیش دس گیارہ سال کے قریب تھی آپ نے اپنا پہلا مضمون ایک اردو کے معروف رسالے کو بھیجا۔ اس رسالے کے ایڈیٹر نے مضمون پڑھنے کے بعد یہ اندازہ قائم کیا کہ یہ کسی بڑے مفکر اور دانشور قسم کے بزرگ ٹائپ آدمی کا کارنامہ ہے ابوالکلام آزاد کو خط لکھ کر طلب کیا اور جب ابوالکلام آزاد کو دیکھا تو بہت حیران ہوا کہ اتنی سے عمر کا بچہ اور ایسا بہترین مضمون ناممکن سی بات ہے دل میں شبہ تھا آخر ابوالکلام سے کہا کہ سچ سچ بتاؤ تم نے یہ مضمون اپنے کس بزرگ سے لکھوایا ہے یا کہاں سے نقل کیا ہے؟ جواب میں مولانا نے وہ الفاظ

ادا کیے جو میدان تقریر و تحریر کے مبتدیوں کے لئے مشعل راہ کا کام دے سکتے ہیں فرمایا:

"محترم یہ مضمون میں نے اپنے اللہ کی عطا کردہ فہم و فراست کے مطابق بذات خود تحریر کیا ہے اگر یقین نہیں آتا تو ابھی کوئی موضوع دے دیں اور محدود وقت میں جتنے صفحات کا مضمون آپ کہتے ہیں ابھی لکھ کر دینے کے لئے تیار ہوں"

اگر یہاں مولانا کے بچپن سے لے کر وقت وفات کے اس قسم کے واقعات کو تحریر میں لایا جائے تو ہر چیز تنگ دامانی کا شکوہ کرتی ہے اور اختصار کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جانے کا خطرہ ہے ابتدا میں عرض یہ کرنا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو اللہ نے بڑی صلاحیتوں سے نواز دیا تھا اور جیسا کہ مالک رام نے تحریر کیا ہے کہ گیارہ بارہ سال کی عمر میں انہوں نے ایک گلدستہ "نیرنگ عالم" کے نام سے شائع کرنا شروع کیا اس سے پہلے ان کے کافی مضامین ہندوستان کے کئی معروف جرائد میں جگہ پاتے رہے لیکن مولانا اپنی ذاتی اشاعت چاہتے تھے اور "نیرنگ عالم" اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا لیکن مولانا کی حق گوئی، بے باکی انگریزی حکومت کو ایک آنکھ نہ بھائی چنانچہ سات آٹھ شماروں کے بعد اس گلدستے پر پابندی عائد کردی گئی لیکن وہی بات ہے جو شاعر مشرق نے کہی ہے۔

تندی باد مخالفت سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

علامہ اقبالؒ نے یہ بات کافی بعد میں کہی جبکہ ابوالکلام آزاد نے اس پر بہت پہلے عمل کر دکھایا۔ چنانچہ 1903ء میں انہوں نے مشہور ماہنامہ "لسان الصدق" جاری کیا اور اپنی حق گوئی کا اظہار بذریعہ تحریر جاری رکھا۔ "لسان الصدق" کی شہرت دور دور تک پھیلی اور ادبی اور علمی حلقوں میں اس رسالے نے ایک خاص مقام بنالیا اور بیشتر لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس رسالے کا ایڈیٹر کوئی بزرگ اور معمر عالم دین ہے۔ چنانچہ "لسان

الصدق" کی بے مثال تحریروں اور خطیبانہ انداز کو دیکھ کر انجمن حمایت اسلام لاہور نے اپنے اجلاس منعقدہ 1904ء میں مولانا کو خطاب کی دعوت دے ڈالی اس وقت مولانا کی عمر بمشکل پندرہ، سولہ سال ہوگی اور اکثر بڑی شخصیات نے مولانا کو دیکھنے کے بعد مایوسی کا اظہار کیا لیکن ان کی مایوسی اس وقت رفع ہوگئی جب مولانا نے اپنی تقریر کے دوران بے خوفی، بے باکی، روانی، چستگی، درستگی، فصاحت و بلاغت، لیاقت و حذاقت اور حق گوئی کا مظاہرہ کیا چنانچہ دوسرے دن پھر مولانا سے تقریر کی درخواست کی گئی۔

ایک بات جو آج بڑی عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے کہ مولانا نے اس دور میں اتنی ترقی کی منازل طے کیں جب مسلمانوں کو پسماندہ اقلیت خیال کیا جاتا تھا اور مسلمانوں میں انگریزی سے واقف حضرات خال خال نظر آتے تھے خود مولانا ابوالکلام آزاد انگریزی سے نابلد تھے لیکن انہوں نے زندگی کے کسی میدان میں اس پہلو کو اپنی کمزوری نہیں بننے دیا جبکہ وہ حیران کن حد تک اردو، عربی اور فارسی زبانوں پر دسترس کے حامل تھے۔

اگر یہاں صرف مولانا کی خطابت یا صرف تحریری کارناموں کا ذکر کیا جائے تو پھر وہی تنگ دامنی آڑے آجائے گی اس لیے اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک تھوڑا سا ذکر ان کے تلامذہ کا بھی ہو جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ دنیا کا یہ اصول ہے کہ تلامذہ اپنے استادوں کی پہچان ہوا کرتے ہیں اللہ کی خصوصی کرم نوازی سے مولانا کو اللہ نے شاگردوں کے معاملے میں بہت عنایات کا مستحق ٹھہرایا تھا۔ مثال کے طور پر یہاں صرف ایک شخصیت کا تذکرہ ہی کافی ہے جن کے بارے میں "رشد" کے قارئین انہیں صفحات میں پہلے پڑھ چکے ہیں یعنی عبدالکریم آغا شورش کاشمیری جن کی خطابت، تحریر، صحافت، شاعری اور سیاست کے بارے میں کسی سے کوئی بات پوشیدہ نہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آغا صاحب کی جملہ صفات اللہ کے خاص فضل و کرم اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تربیت اور مصاحبت کی مرہون منت تھیں۔

خطابت کے میدان میں جو لوازمات کسی مقرر کے لیے ہتھیاروں کا کام دیتے ہیں مولانا ابوالکلام آزاد ان سے لیس تھے۔ اللہ پر ایمان کامل، بے خوفی، اعلیٰ کردار، بے باکی، بہترین گفتار، جرات، وقار، شیریں، سخنی، فصاحت و بلاغت، لیاقت و حذاقت، بے مثال ربط پر مغز طرز تکلم، ناقابل فراموش طرز استدلال اور منفرد زور بیاں ان کی خطابت کا جزو لاینفک تھے آج بعض ہمارے ناقدین حضرات اس قسم کی غلط بیانی کرتے ہوئے ذرا برابر نہیں چوکتے کہ ابوالکلام آزاد جہاد کے مخالف تھے حالانکہ ایسے حضرات ابوالکلام آزاد کے متعلق محض تعصب اور ناواقفیت کی بنا پر اپنی دوکانداری چمکانے کے لئے ایسے ریمارکس دیتے ہیں۔

ابوالکلام آزاد جہاد کے کس حد تک مخالف تھے؟ اگر دفاع میں مفصل تحریر لیا جائے تو بات بہت طوالت اختیار کر جائے گی اختصار کے پیش نظر صرف یہاں ان کی ایک تقریر کا اقتباس پیش خدمت ہے جو انہوں نے 27۔ اکتوبر 1914ء کو کلکتہ میں دوران گفتگو جہاد کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا:

"السیف صدق ابناء من الکتب"

"اے اخوان عزیز! یاد رکھیے دنیا میں امن، صلح اور ترک قتل و غارت کا تصور کتنا ہی خوش نما کیوں نہ ہو مگر دنیا کی بدقسمتی سے اب تک اصلی قوت تلوار کی قوت اور زندگی کا سرچشمہ آب حیات خون کی ندیوں اور فواروں ہی میں ہے۔ دنیا پر اب تک کوئی ایسا زمانہ نصیب نہیں گذرا کہ تلواروں کی صداقت ضعیف ہوئی ہو اور امید نہیں کہ آئندہ بھی ایسا زمانہ نصیب ہو۔ غریب اخلاق نے اپنے تنگنائے بیکسی میں چھپ کر ایسی دنیا کی منتیں مانی ہیں جبکہ تمام کائنات انسانوں کی ملائکہ معصومین کی بہشت زار بن جائے گی اور قتل و خون ریزی کو لوگ اس طرح بھول جائیں گے جس طرح موجودہ عالم نے امن اور صلح کو فراموش کردیا ہے اس آرزو کے حسن و جمال پر کون دل ہے جو فریفتہ نہ ہو لیکن کیا کیجئے کہ دنیا امید و آرزو

ہی نہیں بلکہ حقائق و نتائج کی جگہ ہے اور انسان جب تک فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہے اس وقت تک ایسی امیدوں کا اخلاق کے صفحوں سے باہر پتہ لگنا ممکن نہیں۔ آج اگر پوچھا جائے کہ قوموں کی زندگی اور زندگی کے مظاہر کہاں تلاش کیے جائیں تو اس کا جواب علم و فن کی بڑی بڑی درسگاہوں اور علوم الاولین و الاخرین کے کتب خانوں میں نہیں ملے گا بلکہ ان آہن پوش جہازوں کے مہیب طول و عرض سے جن کی قطاریں ساحل کے طول پر پھیلی ہوئی ہیں اور جن کے روزنوں سے آہن پوش توپوں کے دھانے نکلے ہوئے ہیں"۔

پس حضرات! وہ ہاتھ نہایت مقدس ہیں جن میں صلح کا سفید جھنڈا ہو مگر زندہ وہی ہاتھ رہ سکتا ہے جس میں خونچکاں تلوار کا قبضہ ہو۔ یہی اقوام کی زندگی کا منبع، قیام کی ایک ہی ڈھال ہے لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس با لقسط وانزلنا الحدید فیہ باس شدیدومنافع للناس (ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کو کتاب اور میزان دی تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہوں نیز لوہا پیدا کیا جو ہتھیاروں کی صورت میں سخت خطرناک بھی ہے اور نفع رساں بھی"۔

مذکورہ بالا ریمارکس اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ جذبہ جہاد مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی میں جسد خاکی میں روح کی طرح شامل تھا اس کے علاوہ مولانا کے دل میں امت مسلمہ کا سچا درد تھا اور وہ عالم اسلام کو ایک دیکھنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب جنگ عظیم کے وقت عصر حاضر کے دین کے ٹھیکیداروں کے اسلاف اور بزرگ انگریز کے بوٹ چاٹ رہے تھے اور ترکوں کی خلافت کے خلاف اپنے حلقہ اقتدار اور حلقہ مریدین میں زہر اگل رہے تھے اس وقت ترکوں کی خلافت کی حمائت میں جو آوازیں سب سے زیادہ بلند تھیں ان میں ایک مولانا ابوالکلام کی تھی اس موقع پر انہوں نے

خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"تمام دنیا سے ہمارا صرف ایک رشتہ ہے دینی اخوت اور پان اسلام ازم کا مگر ترکوں سے ہمارے دو رشتے ہیں دینی اخوت اور مسلمان برادری اس لیے اللہ نے ہم کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کا غمخوار بنادیا ہے دوسرا اس سے بھی زیادہ قوی خلافت دینی اور اسلام کے آخری سیاسی مرکزی ہونے کا آج کلمہ اسلام کی حفاظت کی آخری تلوار صرف ان کے ہاتھ میں ہے اگر کسی اور خطہ سے اسلام کی حکومت مٹتی ہے تو ہم خیال کرتے ہیں کہ ہمارا ایک عضو کٹ گیا لیکن ترکوں پر جب کوئی آفت لائی جاتی ہے تو ہم تڑپ جاتے ہیں کہ ہمارا دل دو نیم ہوگیا ترکوں کے لئے مضطرب ہوتے ہیں تو ہمارا اضطراب مسلمانوں کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اسلام کے لیے ہوتا ہے۔"

وما كان قيسا هلكه هلك واحدا
ولكنهٔ بنيان قوم تهدما

"انتظامی مصلحتیں اور اختصار کے تقاضے مزید اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ اس شخصیت کے بارے میں خطابت کے حوالے سے زیادہ الفاظ زیب تحریر لائے جائیں نمونے کے طور پر یہ دو اقتباسات پیش کردیے ہیں مزید واقفیت کے لئے مالک رام کی مرتب کردہ کتاب "خطبات ابوالکلام" سے استفادہ کیا جاسکتا ہے"

بہت مناسب ہوگا اگر اجمالی طور پر مولانا کے تحریری کارناموں کا ذکر بھی کردیا جائے جو ان کے نامہ اعمال میں صدقہ جاریہ کے طور پر شامل ہوکر ان کے مرتبہ اور مقام میں علو کا باعث بنیں گے۔ ان شاء اللہ

جس طرح کہ ابتداء میں ذکر ہوچکا ہے تقریر کی طرح تحریر کا فن بھی مولانا کو اللہ تعالیٰ نے کم سنی میں ہی عطا کردیا تھا مولانا کی تحریری کاوشیں اردو ادب کا ایک انمول خزانہ ہیں اور ادب کے شائقین کے لئے گراں سرمایہ، مولانا نے اپنی زندگی میں بڑا

تحریری کام کیا ابتداء ایک چھوٹے سے گلدستے سے کی اور دوران سفر بے شمار مراحل سے گزر کر آخر کار الہلال تک پہنچ گئے۔ "الہلال" کیا ہے اس کا اندازہ وہی آدمی کر سکتا ہے جس نے اس کا مطالعہ کیا ہو مولانا کا ایک مشہور جملہ ہے کہ "میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں" اور انہوں نے ساری زندگی اس چند الفاظ پر مشتمل جملے کو ثابت کرنے کی کوشش میں گزار دی اور اپنی کوششوں میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔ جس طرح خطابت کے میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا اور ہم عصران کے بارے میں یہ خیال کرتے تھے کہ گویا اللہ نے ساری امت کا زور بیاں جمع کر کے ابوالکلام کو دے دیا ہے اس طرح تحریر کے میدان میں بھی ان کی بے باکی، جرات، بے خوفی، بے لاگ تبصروں اور سچائی و صداقت کے سب معترف تھے حساس طبیعت کی وجہ سے حالات کا بغور مشاہدہ کرتے اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مطالعہ اور مشاہدہ کی بنا پر ایسا تجزیہ کر کے تحریر فرماتے کہ مخالفین بھی اس کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکتے۔

"الہلال" اس دور میں ایک مقبول ترین پرچہ ہی نہیں بلکہ ایک تحریک کا نام بن گیا اور انگریز کی حکومت "الہلال" سے اس طرح خائف تھی گویا یہ ایک چھوٹا سا پرچہ نہیں بلکہ حکومت کی ایک بہت بڑی باغی فوج کا ترجمان ہے یہی وجہ ہے کہ حکومت وقت نے بہت جلد اس پر پابندی عائد کر دی لیکن مولانا کے جذبات کو دبانا کسی کے بس کی بات نہیں تھی آج بھی اگرچہ ان کی تحریریں بڑی مشکل سے بڑی محدود تعداد میں دستیاب ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی اہمیت مسلمہ ہے اور علمی اور ادبی حلقوں میں ان کو ایک مسند سند کی حیثیت حاصل ہے۔ مولانا کی شہرہ آفاق تفسیر "ترجمان القرآن" علمی حلقوں کی جان ہے اور ادبی حلقوں میں بھی اس کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

اس وقت میرے سامنے مولانا کا ایک چھوٹا سا رسالہ "امر بالمعروف" ہے صرف تعارف اور نمونے کے لئے اس کا ایک چھوٹا سا اقتباس پیش خدمت ہے۔

"اخلاق کے سینکڑوں مشکل مسائل میں سے ایک مشکل تر مگر اصولی

مسئلہ حب و بغض و تولا و تبرا، تحسین و تذلیل اور عفو و انتقام کا بھی ہے ایک طرف اخلاق ہم کو تلقین کرتا ہے کہ دل کو محبت کے لئے مخصوص کردو کہ اس گھر کے لئے یہی فانوس موزوں ہے۔ انیس سو برس بیشتر ایک اسرائیلی واعظ کہتا ہے کہ دشمنوں کو بھی پیار کرو کیونکہ اگر چاہنے والوں کو چاہا تو تمہارے لیے کیا اجر؟ اخلاق کے اولین اور سامنے کے سبق یہ ہیں کہ پیار کرو، خاکسار بنو، کسی سے بغض نہ رکھو، سب کی عزت کرو، انسان کی انسانیت کا بغیر تفریق ادب کرو، جس کو سامنے دیکھو سر جھکادو۔ سوسائٹی نے بھی ان تعلیمی قدروں کو اعتقاداً قبول کیا ہے اور اصلاحی اخلاق مروت، پاس و لحاظ، شرم و حیات، شرافت، انسانیت تمام الفاظ انہیں معنوں میں بولے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں اسی اخلاق کا ایک دوسرا پارٹ ہے جہاں آکر اس کی یہ غریب و مسکین صورت ایک سخت اور جابرانہ خشونت سے مبدل ہو جاتی ہے اور دنیا میں اگر اس کی صدا پہلی تعلیم دیتی ہے تو خود اس کا عمل دوسری شکل میں سامنے آتا ہے وہ چور کو قید کرتا ہے، قاتل کو پھانسی پر چڑھاتا ہے، نیکی کی جتنی تعریف کرتا ہے، بدی کو اتنا ہی برا بھی کہتا ہے، زید کو کہتا ہے کہ وہ نیک ہے اس لیے اچھا ہے عمر کو کہتا ہے کہ تم بداعمال ہو اس لیے برے ہو ظالم سے اس کا ظلم کا اور مجرم سے اس کے جرم کا مطالبہ کرتا ہے۔ پہلی حالت میں جس قدر عاجز تھا اتنا ہی اس حالت میں مغرور اور متکبر ہو جاتا ہے پہلے اگر عاجزوں کے جھکے ہوئے سروں کو اٹھا کر اپنے سینے پر جگہ دیتا تھا تو اس پرکشوں کے سروں کو اپنی ٹھوکروں سے پامال کرتا ہے اور ساتھ ہی حالت یہ ہے کہ اس کی پہلی تعلیم سے صرف معبدوں اور خانقاہوں میں رونق پیدا ہوتی تھی تو اس عمل سے پوری دنیا میں انتظام اور قانون نافذ ہوتا ہے"

یہ ایک ہلکی سی جھلک اس تحریر کی تھی جس کو مولانا ابوالکلام آزاد کی عام

بقیہ صفحہ نمبر 40 پر